انجمن ترقی اردو ہند کا

ہفتہ وار اخبار

قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
ڈیڑھ آنہ
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڈھ

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۴	علیگڈھ - ۲۲ مارچ ۱۹۵۷ ع	شمارہ ۱۲

رفتار

خلیل الرحمٰن اعظمی

اختر انصاری اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے معروف ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، منفرد افسانہ نگار اور ایک سلجھے ہوئے نقاد ہیں۔ ان کے شعری مجموعے نغمۂ روح، آبگینے، انتخاب، روح عصر اور خندۂ سحر، افسانوی مجموعے اندھی دنیا، نازو، اور ایک قصہ سنو، اور تنقیدی کتابیں افادی ادب اور ایک ادبی ڈائری جدید اردو ادب کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب حال ہی میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا ہے اور ان کے متفرق تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بھی جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ ان کی تمام تصنیفات کے پیش نظر اردو زبان کا کوئی مورخ ان کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان کے ادبی کارناموں میں سب سے زیادہ مقبولیت ان کے قطعات کو حاصل ہوئی ہے۔ اردو شاعری میں جب کبھی قطعات کا ذکر آتا ہے تو سب سے پہلے اختر انصاری کی طرف ذہن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اختر انصاری سے پہلے اردو میں قطعہ نگاری ایک ضمنی سی چیز تھی جس طرح ایک مدت تک ہمارے یہاں رباعی بعض ثابت شدہ اخلاقی مضامین کو رسمی طور پر ادا کرنے کا ایک وسیلہ بنی رہی اسی طرح قطعہ بھی محض روایتی انداز کا ذریعہ اظہار تھا جسے ہمارے شعراء منھ کا مزہ بدلنے کے لئے اختیار کرتے تھے۔ ہمارے تمام جذباتی، کیفیاتی اور فکری تجربات کا اظہار اپنی تمام فنی نزاکتوں کے ساتھ غزل، مثنوی، مرثیے اور نظم میں ہی ہوا ہے۔ لیکن جس طرح فارسی میں خیام نے صرف اپنی رباعیات میں اپنی پوری شخصیت کو منتقل کردیا ہے اور اس طور پر ایک غیر فانی حیثیت حاصل کرلی وہی کام اردو میں اختر انصاری نے قطعہ نگاری کے سلسلے میں کیا ہے۔ جن لوگوں نے "آبگینے" پڑھی ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ یہ قطعات احساس کی نزاکت، جذبات کی شدت، اور رومانی و جمالیاتی کیفیات کے کتنے حسین اور دلاویز نمونے ہیں۔ چونکہ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا نیا اور منفرد تجربہ تھا اس لئے خود اختر انصاری کے فنی اکتسابات میں سب سے زیادہ ان قطعات کا مقبول ہونا ایک فطری امر ہے کیونکہ یہی ایک ایسا میدان ہے جس میں اب تک ان کا کوئی حریف نہیں۔ جدید میں مجاز، فیض، اور ساحر لدھیانوی نے بھی بعض اچھے قطعے لکھے لیکن ان کے یہاں بھی اس کی حیثیت محض منھ کا مزہ بدلنے کی ہے۔ البتہ احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، مخدوم، جاں نثار اختر اور نریش کمار شاد نے خاص طور پر اس صنف کو اپنایا لیکن ان تمام شاعروں کے قطعات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان شعراء نے قطعے کی خارجی ساخت اور اس کی صنفی حیثیت کو تو ضرور ملحوظ رکھا لیکن وہ چیز جو اختر انصاری کے قطعات کا خاصہ ہے ابھی تک ان شعراء کی دسترس سے باہر ہے۔ اختر کے قطعات کا مجموعہ "آبگینے" کے نام سے شائع ہوچکا ہے اس میں جو قطعات ہیں وہ علیحدہ کسی منظر کی خارجی عکاسی یا کسی تشبیہ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

ان کی شاعری کا رشتہ جوش سے ملتا ہے اور اس میں نوحہ گری کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ یہی کیفیت احمد ندیم قاسمی کے قطعات کی ہے۔ ان کے قطعات کا مجموعہ "دھڑکنیں" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن "رم جھم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ندیم کے یہاں ایک افسانوی فضا اور پنجاب کے دیہاتوں کا مخصوص رومان ہے اور اس کی وجہ سے ان قطعات میں ایک مقامی رنگ ہے۔ جاں نثار اختر کے قطعات اس سے بھی خالی ہیں۔ جاں نثار کا فن ابھی تک تقلید سے آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ اور ابھی تک جوش، احسان دانش اور دوسرے شعرا کا سایہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم اور غزل کی طرح ان کے قطعات میں بھی ان کا اپنا کوئی لب و لہجہ نہیں ہے جسے صرف انھیں سے مخصوص کیا جا سکے۔ ندیم اور نریش کمار شاد نے بعض اچھے قطعات لکھے ہیں لیکن جس طرح ان کی غزلوں میں روانی اور سرمستی کے باوجود ایک طرح کے ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے، وہی حال ان کے قطعات کا بھی ہے۔ ان کی غنائیت ضرور اپنے اندر دلکشی رکھتی ہے لیکن زندگی کے گہرے اور متنوع تجربات کو ہضم کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔ نریش کمار شاد نے اپنے قطعات کا مجموعہ "قاشیں" کے نام سے شائع کیا ہے اس پر ایک دیباچہ اختر انصاری کے قلم سے ہے۔ یہ دیباچہ کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ لکھتے ہیں:

"آج سے تقریباً تیس سال قبل جب میں نے شعر کہنا شروع کیا تو آغاز کار ہی سے نظم اور غزل کے ساتھ قطعے کو بھی اپنا مطمح نظر بنایا اور اس باب میں میرا مخصوص اسلوب بہت جلد واضح اور متعین ہو گیا۔ میں نے شروع ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ قطعے کا کوئی مصرعہ بیکار یا محض بھرتی کا نہ ہو۔ پہلے مصرعے سے چوتھے مصرعے تک نہ صرف خیال کا تسلسل بلکہ خیال کا ارتقا بھی پایا جائے گویا پہلے مصرعے میں جو بات کہی گئی دوسرا مصرعہ اس بات کو آگے بڑھائے اور اسی طرح چوتھے مصرعے تک مضمون پھیلتا بڑھتا اور بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے۔ پھر خیال کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ تاثر بھی زیادہ سے زیادہ گہرا ہوتا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح جو قطعہ وجود میں آئے گا وہ اس قطعے سے یکسر مختلف ہوگا جس میں شاعر آخری مصرعہ کہہ کر اوپر کے تین مصرعے چپکا دیتا ہے اور ان تین مصرعوں کا مضمون تقریباً وہی ہوتا ہے جو چوتھے مصرعے میں ادا کیا جا چکا ہے۔ یہ جدید الاسلوب قطعہ دراصل ایک سمٹی ہوئی نظم ہوگا۔ اور کوزے میں دریا کو بند کرنے والی کیفیت کا نمونہ پیش کرے گا۔ چاروں مصرعوں کا یکساں اہمیت اور افادیت اس کی بنیادی خصوصیت ہوگی۔ یہی خصوصیت ایک طرح سے کسوٹی کا کام دے گی یعنی اگر ہم دیکھیں گے کہ ابتدائی دو مصرعے خارج کر دینے سے قطعے کا مفہوم اور تاثر مجروح نہیں ہوتا تو ہم قطعے کو ناقص اور ساقط الاعتبار خیال کریں گے۔

اس مخصوص اسلوب کی پیروی میرے سب نہیں تو بہت سے قطعوں میں کچھ اس طور سے ہوتی ہے کہ قطعے کے پہلے دو مصرعوں میں ایک خاص ماحول کی مصوری پائی جاتی ہے یا ایک خاص فضا کے نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے یہ گویا ایک عقبی زمین ہوتی ہے، ایک پس منظر ہوتا ہے جس میں قطعے کے مرکزی اور بنیادی خیال کو خوبصورتی اور اثر انگیزی کے ساتھ ابھارا جا سکتا ہے۔ پھر تیسرے مصرعے میں اس پس منظر کا سہارا لیتے ہوئے ایک عمومی انداز کی بات کہی جاتی ہے۔ یہ بات اس سادے پس منظر کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ پیش کردہ ماحول کے نقوش کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس تیسرے مصرعے ہی کے ساتھ اس تاثراتی کیفیت کا بھی آغاز ہو جاتا ہے جس کی تکمیل قطعے کے مجموعی تاثر کی حیثیت سے آگے چل کر چوتھے اور آخری مصرعے میں ہوگی۔ مثلاً اگر قطعہ اپنے مجموعی تاثر کے لحاظ سے حزنیہ یا المیہ ہے تو تحسر یا تالم کی کیفیت اسی مقام سے ایک نرم آنچ کی طرح ہریں لینا شروع کر دے گی۔ اگر قطعے کا رنگ نشاطیہ ہے تو انبساط و ابتہاج کی کلیاں ابھی سے چٹکنی شروع ہو جائیں گی۔ تیسرے مصرعے کی یہ جذباتی تحریک چوتھے مصرعے میں ایک جامع فیصلہ کن اور ہمہ گیر قطعیت کے ساتھ اختتام کو پہنچتی ہے۔ جہاں ایک شدید، عمیق، انفرادی اور زیادہ سے زیادہ اندرونی جذبے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ گویا قطعے کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر پہنچ کر قطعہ اپنی انتہائی جذباتی بلندی کو چھو لیتا ہے۔"

اس معیار کو سامنے رکھ کر ہم اختر انصاری کے کچھ پرانے اور نئے قطعات یہاں درج کرتے ہیں۔

جو پوچھتا ہے کوئی آج کیوں ہیں سرخ آنکھیں
تو ہنس کے ٹال کے یہ کہتا ہوں رات سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا تھا میں نے — کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو پیسنا دیتا اگر خبر ہوتی — پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

میں نے اک بار کہا تم سے محبت ہے مجھے — تم نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب کیا دیا
اہل دل ناشاد رہے خارت ہو جائے — اس تند و تند سے دھڑکا کہیں کچھ نہ ہو سکا

قدم آہستہ رکھ کر سکون ہے — کوئی کونپل زمیں سے پھوٹتی ہو
یا کسی پھول کی کلی مرد ست — مزے خواب عدم کے لوٹتی ہو

یہ تری تخلیق نا فرجام یہ شیریں زمیں — تا ابد یونہی رہے گی اس میں تو مصروف ہے
آگ سینے سے لگائیں خاک پر جیتے — جیتے ہم مجبور ہیں اتنا ہی تو مجبور ہے

آخری دو قطعے نئے ہیں اور ان میں اختر انصاری اس ذہنی سطح تک پہنچ گئے ہیں جو خیام کا حصہ ہے۔

ہماری زبان

۲۲۔ مارچ ۱۹۵۷ء

سنسکرت اور ہندستان

ہر قصر کی تعمیر کے لئے بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدید ہندستان کی تعمیر کے لئے بھی علاوہ مادّی وسائل کے ذہنی قدروں کی ضرورت ہے ان ذہنی قدروں میں ماضی کے تہذیبی ورثے کی اہمیت سے کسے انکار ہوگا۔ آزادی کے بعد سنسکرت کے احیا کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ اس وجہ سے فطری ہیں کہ ہندستان کی مختلف زبانوں کو کسی نہ کسی طرح سنسکرت نے متاثر کیا ہے اور سنسکرت کا ادبی سرمایہ اپنی عظمت کی وجہ سے دنیا کے ادبی ورثے کا ایک اہم جزو ہے۔ کلاسیکی ادب کی اہمیت کو نئے سرے سے دریافت کرنا اچھی چیز ہے۔ اس نے انسان دوستی حسن کاری اور اخلاق کی تنظیم کا جو پیام پیش کیا ہے اس کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ مگر اس جوش و خروش میں جدید دور کی ضروریات، جدید زبانوں کے مطالبات اور علمی تصورات کو نظر انداز کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ماضی کا احساس اچھی چیز ہے ماضی پرستی اچھی نہیں۔

آج ہر گوشے سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ سنسکرت کو پھر زندہ کرنا چاہئے۔ سنسکرت کی تعلیم کے لئے کرکشیتر میں ایک یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے، ہر ریاست سنسکرت کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ مسٹر کے ایم منشی گورنر یو پی اور ڈاکٹر سمپورنا نند یو۔پی کے بڑے وزیر اس سلسلے میں برابر تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ ابھی حال میں بہار سنسکرت سمتی کے کانووکیشن کے موقع پر مسٹر کرشنم چاری نائب صدر منصوبہ بندی کمیشن نے اپنے خطبے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ہندی کو اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات کے اظہار کے قابل بنانا ہے تو سنسکرت کو ایک زندہ اور توانا قوت کی حیثیت سے ترقی دینا چاہئے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ ثانوی مدارس میں سنسکرت کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے یونیورسٹی میں علاوہ آنرس کے سنسکرت کا ضمنی کورس بھی ہونا چاہئے جو زیادہ سے زیادہ لوگ لے سکیں۔ نیز اعلیٰ تحقیق و تدقیق کے لئے وسائل مہیا کئے جائیں اور قدیم تعلیمی درسگاہوں کو مناسب اصلاح کے بعد باقی رکھا جائے۔ ہمیں ان تجاویز سے اختلاف نہیں۔ اپنے کلاسیکل سرمائے سے بیگانہ رہ کر ہم اپنے ذہن کی صحیح تربیت نہیں کر سکتے۔ لیکن اس خطرے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک کلاسیکل ادب سے جدید ذہن کو آشنا رکھنا اور اپنے تہذیبی ورثے سے استفادہ کرنا اور چیز ہے اور سنسکرت کے احیاء پر ساری توجہ مرکوز کر دینا اور جدید زبانوں کے حقوق کو نظر انداز کر دینا دوسری چیز۔ سنسکرت کا درجہ بہت بڑا سہی۔ مگر وہ جدید ہندستانی زبانوں کی جگہ نہیں لے سکتی۔ جدید ہندستانی زبانیں سنسکرت سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں اور اب بھی اٹھا سکتی ہیں۔ مگر کوئی درخت صرف زیر زمین نہیں رہتا۔ وہ زمین کے اوپر سورج کی روشنی اور ہوا سے بھی غذا حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح جدید ہندستانی زبانوں کو سنسکرت کی غلامی سے آزاد ہو کر موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق چلنا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے مادری زبانوں کی ترقی کی طرف توجہ کرنا ہو گی۔ ان کی ترقی کے لئے جس طرح سنسکرت اور فارسی جیسی کلاسیکی زبانوں سے مدد لینا ہے۔ اسی طرح دنیا کی دوسری اہم زبانوں مثلاً انگریزی، چینی، روسی، عربی، ہسپانوی سے بھی مدد لینا ہے۔ ہماری زبانیں صرف سنسکرت کے سہارے جدید افکار کی ترجمانی کی اہل نہیں ہو سکیں۔ ادب افکار کا ایک آئینہ خانہ ہوتا ہے۔ ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ انسان دوستی، رواداری، اخلاقی بلندی کے علاوہ قدیم ادب میں قدیم اور فرسودہ افکار بھی ہیں جو بڑی چابک دستی سے ذہن کو ماضی کی طرف موڑ دیتے ہیں اور رجعت پرستی کے عناصر کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ہمیں برابر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس شاندار ادب کے باوجود ہندستان صدیوں تک غلام رہا اور شاید اس کے ذریعے تقدیر پرستی، جبر، ترک دنیا اور انسان کی بے بضاعتی کے جراثیم بھی پرورش پاتے رہے۔ آزادی کے بعد اچھی ہر چیز سے محبت بڑی چیز ہے مگر اس محبت میں ایک ہوش مندی اور دانائی کی بھی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے ادب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر نظر رکھنی چاہئے اس کے بلند و پست دونوں کا احساس ہونا چاہئے۔ جہاں اس میں انسان کی روح کو بہترین غذا مل سکتی ہے وہاں ایسے خرافات کی کمی بھی نہیں جو آج ہمارے کام نہیں آ سکتے۔ جہاں اس میں بہتے پانی کی سی روانی ہے وہاں اس میں سناٹے کی ایسی سخت تیرگی بھی ہے کہ شعور کا خون ہو جائے۔ اس لئے ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ جدید ہندستانی زبانوں کی ترقی پر پوری توجہ کریں اور پھر ان کی ترقی کے لئے کلاسیکل زبانوں سے بھی مدد لیں۔ سنسکرت ہندستانی تہذیب کی وحدت کا ایک مظہر ہے۔ اس وحدت میں کثرت کی جلوہ سامانی پر بھی نظر ہونا چاہئے۔ انسان کو اچھی اور عالمی رجحان پیدا کرنا ہے اور ماضی پرستی سے آزاد ہونا ہے۔ پیچھے مڑ مڑ کر ہی دیکھتے رہنے سے کبھی کبھار آدمی پتھر بھی ہو جاتا ہے۔

انجمن کی خبریں

دہلی محترمہ بیگم انیس قدوائی صاحبہ کی زیر صدارت ۱۸-مارچ ۵۷ء کی شام کو انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کی نشست ہوئی۔ اس نشست میں میران انجمن کے علاوہ جناب روش صدیقی۔ سلام مچھلی شہری حسن نعیم، شمیم کرہانی، حلیم اختر، مالک رام، خاور دہلوی، طالب دہلوی، بیگم سعادت بانو کچلو، باجرہ بیگم صاحبہ، بیگم احمد محی الدین اور جناب مظہر امام صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔

بانسوٹ (گجرات) ۶ مارچ کو جناب سید صاحب کی رہائش گاہ پر مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا جس میں طے پایا کہ ۲۴ مارچ کو ایک عام جلسہ کیا جائے۔ اس جلسے میں مشاعرہ کا پروگرام بھی شامل ہوگا۔ مشاعرہ میں مقامی شعرا کے علاوہ سورت وغیرہ کے شاعروں کو بھی مدعو کیا جائے گا۔ جلسے کا انتظام کرنے کے لئے چھ ممبروں پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔

اس مجلس میں ممبری فیس کے متعلق بھی غور کیا گیا۔ ماہانہ فیس وصول کرنے میں چونکہ کافی تکلیف ہوتی ہے لہذا طے ہوا کہ ماہانہ فیس کی بجائے سالانہ فیس دو روپے کردی جائے۔

کشمیر جناب سید محمد اکبر صاحب جے پوری اطلاع دیتے ہیں کہ بزم اردو کشمیر کی مجلس عاملہ نے اپنے ایک خصوصی اجلاس میں بہ اتفاق آرا منظور کیا کہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کی شاخیں کشمیر میں قائم کی جائیں۔

شاخ سری نگر کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب کئے گئے

صدر، شمیم احمد شمیم ادیب کامل (علیگ)، نائب صدر آغا ایس ایم حسین ادیب کامل (علیگ)، سکریٹری: سید محمد اکبر جے پوری - معتمد معاون خضر سوپلی۔ ناظم دفتر محمد یوسف راجہ ادیب کامل، ارکان مجلس انتظامیہ (۱) مظفر عازم (۲) علی محمد خاموش (۳) غ۔م۔جانباز (۴) یوسف ٹینگ

سنگھ بھوم (جمشید پور) شاخ انجمن ترقی اردو سنگھ بھوم اور نوین پنجابی سبھا نے مشترکہ طور پر ایک اپیل جاری کی ہے کہ ۲۲ مارچ کے یوم بھگت سنگھ کے پروگرام میں لوگ بکثرت شریک ہوں اور انجمن کی رکنیت جلد سے جلد قبول کریں۔ انجمن کی ممبری سالانہ فیس صرف ایک روپیہ بتائی گئی ہے۔

مرکزی انجمن مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کی مجلس عام اور دوسری کمیٹیوں کے جلسے ۳۰-۳۱ مارچ ۱۹۵۷ء کو ہورہے ہیں اراکین کو اطلاع نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔

ان جلسوں میں بجٹ وغیرہ کے علاوہ اردو کانفرنس کے انعقاد کی تاریخیں بھی طے کی جائیں گی۔

اردو کانفرنس جن حضرات کو ۲۰-۲۱ مارچ کو ہونے والی اردو کانفرنس کے دعوت نامے بھیجے گئے تھے انہیں التوا کی اطلاع خط کے ذریعے بھیجی جاچکی ہے۔

لغت کمیٹی ۲۲-مارچ ۵۷ء کو اردو لغت کمیٹی کا پہلا جلسہ دفتر انجمن میں منعقد ہورہا ہے تاکہ لغت کی اسکیم مرتب کرے اور لاگت کا تخمینہ لگائے۔

انبالہ (پنجاب) جناب ملک اوم پرکاش صاحب آنند جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو انبالہ اپنے ایک گرامی نامے میں لکھتے ہیں کہ ماہ اپریل کے آخری ہفتے میں ایک سہ روزہ کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے جس میں پنجاب سے ایسے حضرات کو مدعو کیا جائے گا جو شاخوں کے قیام میں معاون و مددگار ثابت ہوں اور رات میں ایک شاندار مشاعرہ بھی کیا جائے عوام کو مشاعروں اور اردو سے دلچسپی ہے اس لئے توقع ہے کہ یہ کانفرنس اور مشاعرہ کامیاب ہوگا۔

جے پور (راجستھان)

دو اردو نواز ہستیوں کا سانحۂ ارتحال

گزشتہ ماہ فروری میں جے پور راجستھان کی دو اردو نواز ہستیوں نے انتقال کیا۔

(۱) راجہ پنڈت امرناتھ اٹل ایم۔ اے۔ ریٹائرڈ وزیر خزانہ ریاست جے پور
(۲) ناظم الملک مولوی سید مشوق حسین اطہر ہاپوڑی۔

اس سلسلے میں آج ۴ بجے شام مسلم مسافر خانہ جے پور کے اردو ہال میں انجمن ترقی اردو راجستھان اور انجمن ترقی اردو شاخ جے پور کا ایک ملا جلا اجلاس ہوا جس میں خاص خاص ادبا اور شعرا نے شرکت کی۔ حسب ذیل دو ریزولیوشن یکے بعد دیگرے منظور کیے گئے۔

(۱) دونوں انجمنوں کو راجہ پنڈت امرناتھ اٹل ریٹائرڈ وزیر خزانہ ریاست جے پور کی وفات کا نہایت رنج و الم ہے اور ہم مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا پورا یقین دلاتے ہیں۔ اور اس غم میں ان کے برابر کے شریک ہیں۔ موصوف کی ذات بلحاظ علم و ادب اور بالخصوص اردو زبان سے پورا شغف ہونے کے باعث راجستھان میں بہت بڑے مرتبہ کی حامل تھی انھوں نے دو آل انڈیا مشاعروں منعقدہ جے پور کی بھی صدارت فرمائی تھی۔ اور گزشتہ مارچ ۱۹۵۶ء میں آل راجستھان اردو کنونشن منعقدہ جے پور کی بھی صدارت نے ہو گئے۔ راجستھان میں بحیثیت ادب نواز خالی ہے اس کا پر ہونا ممکن نہیں خدائے بزرگ و برتر ان کی روح کو سکون و راحت عطا کرے۔

دونوں انجمنوں کو ناظم الملک مولوی سید مشوق حسین اطہر کی وفات کا نہایت رنج و ملال ہے۔ اور ہم مرحوم کے پسماندگان سے پوری ہمدردی کا یقین دلاتے ہیں۔ نیز اس غم میں ان کے برابر کے شریک ہیں موصوف بلند پایہ شاعر اور باکمال اہل فن تھے جے پور کے مشاعروں کو اپنی شرکت سے انھوں نے کامیاب کیا اور جے پور کے دونوں آل انڈیا مشاعروں میں نمایاں خدمت ادب کی کی۔ گزشتہ سال ہوتے انعقاد کل راجستھان اردو کنونشن تاریخی ۲۹، مارچ تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۷ء

۲۲ باوجود پیری و ضعف و عوارض جسمانی کراچی سے جے پور تک کا سفر محض خدمت زبان اور محبت احباب کی خاطر کیا۔ پروردگار عالم ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل اور مرحوم کو جوار رحمت عطا فرمائے۔ دونوں ریزولیوشن کھڑے ہو کر منظور کیے گئے۔

انتخابات اور اُردو

جناب دانش نوشہروی اطلاع دیتے ہیں۔

الیکشن کے سلسلے میں تمام پارٹیوں نے اپنے پوسٹر ہینڈ بل وغیرہ اردو میں استعمال کئے۔ اور اپنے مینی فیسٹو میں اردو کو ختم کرنے والے "ڈیپک" نے سب سے زیادہ اردو اشتہار تقسیم کئے جب کہ ان کا دیہاتی علاقے میں کوئی ہندی کا پوسٹر نظر نہیں آیا۔ ووٹروں کو دینے والی پرچیاں اگرچہ گورمکھی میں چھپی ہوئی تھیں لیکن ان کی خانہ پری اردو میں کی گئی۔

حکومت کی انتھک کوششوں کے باوجود جو بلا وجہ پنجاب سے اردو کو دیس نکالا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ ارباب اقتدار کو الیکشن جیتنے کے لئے اردو سہارے کی ضرورت پیش آئی۔

ہولیوں کے دنوں میں چند ہندو سکھ نوجوانوں نے مل کر اردو کے دو ڈرامے اسٹیج کئے جن میں جبراً کہیں کہیں ہندی کے الفاظ ٹھونسے گئے تھے رات کے ۲ بجے تک قریباً دو ہزار کی حاضری ڈراموں میں دلچسپی لیتی رہی، اور کافی مالی امداد بھی کی۔

خالص دیہاتی علاقہ میں اور وہ بھی پنجابی ایریا میں دو ہزار کی حاضری وہاں اردو کی ہر دلعزیزی کا بیّن ثبوت ہے۔ اور پھر اس علاقہ میں بچوں کو دکھ سے کے لئے بھی کوئی مسلمان نہیں۔ اس سے کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلے کے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔

دانش نوشہروی
بدست نوشہرہ پنوان ضلع امرت سر

غزل

غم حبیب غم دو جہاں نہیں ہوتا
اگر خلوص وفا بیکراں نہیں ہوتا

دلوں کی آگ بڑھاؤ کہ لوگ کہتے ہیں
چراغِ حسن سے روشن جہاں نہیں ہوتا

کسی کے خون کی سرخی نہ ہو بہاروں میں
بلا سبب تو کوئی بدگماں نہیں ہوتا

ہزار رقص بہاراں قریب ہو لیکن
چمن میں برق کی ہو آشیاں نہیں ہوتا

تری نگاہ کرم ہی کا یہ اثر تو نہیں!
جہاں میں ہم پہ کوئی مہرباں نہیں ہوتا

شعور منزل مقصود بھی ہے شرط سفر
ہجوم راہ رواں کارواں نہیں ہوتا!

(انور معظم)

جامعہ اردو کا جلسہ تقسیم اسناد

جامعہ اردو کا جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونین ہال میں ۔۔ مارچ بوقت ساڑھے گیارہ بجے دن منعقد ہوا جلسہ کی صدارت کے فرائض عالی جناب نواب رحمت اللہ خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور و رئیس جامعہ اردو نے انجام دیئے۔ سب سے پہلے رجسٹرار جامعہ اردو نے سالانہ روداد پیش کی۔ جامعہ کی روز افزوں ترقی سے حاضرین بہت متاثر ہوئے۔ سالانہ روداد کے بعد کامیاب امیدواروں کو جناب صدر نے صداقت نامے اسناد اور امتحانات میں اول آنے والوں کو تمغہ جات تقسیم کئے۔

اس کے بعد نائب امیر جامعہ عالی جناب پنڈت راج ناتھ صاحب کنزرو صدر انجمن ترقی اردو آگرہ نے جلسے سے خطاب فرمایا۔ نائب امیر جامعہ نے جامعہ کی رفتار ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے خلوص کے ساتھ عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ، جامعہ اردو علی گڑھ کی خدمات کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ جامعہ اردو کی روز افزوں ترقی ڈاکٹر صاحب موصوف کی غیر معمولی توجہ اور بصیرت کا نتیجہ ہے۔

امیدواران جامعہ سے خطاب کرتے ہوئے پنڈت جی نے فرمایا:۔

"ادب کسی سیاسی جماعت کے نعرہ کو نہیں کہتے، آزاد ہندوستان میں ایک آزاد مہذب شہری کی طرح اپنے ادب اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرو۔ سچی لگن اور خلوص قلب کے ساتھ زبان کی شمع جلاؤ اور اس میں انسانیت کا چہرہ دیکھو۔"

زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اردو کے مسئلہ کو مذہب یا سیاست کا مسئلہ نہ بنایئے۔

جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ ایک بجے ختم ہوا جناب صدر کی جانب سے نسیم قریشی صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ شام کو جامعہ اردو کی جانب سے ایک پر تکلف عصرانہ کے بعد یہ سالانہ تقریب کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔

(سید حامد حسین جیلانی اسسٹنٹ رجسٹرار)

قارئین ہمایوں سے بہ ادب درخواست کرتا ہوں کہ وہ براہ کرم وقتاً فوقتاً اپنی ادبی نگارشات اور عملی تجاویز سے مجھے مستفید کریں اور ہمایوں کو بصورت احسن مرتب کرنے اور اسے ترقی دینے میں میری مدد فرمائیں۔

بشیر احمد

مدیر "ہمایوں" المنظر ۳۲۔ لارنس روڈ لاہور

رفتار

حضرت اثر لکھنوی کا مکتوب

مکرمی تسلیم!

۱۰ مارچ کے ہماری زبان میں "رفتار" کے تحت حضرت خلیل الرحمٰن اعظمی ارشاد فرماتے ہیں کہ "اثر لکھنوی نے بھی مختلف زبانوں کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کی نظموں کا مجموعہ "رنگ بست" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اثر اکثر و بیشتر ترجمے میں کامیاب رہے ہیں۔ البتہ نذر الاسلام کی نظموں کے ترجمے میں وہ آتشیں انداز نہیں پیدا ہو سکا ہے" رنگ بست میں نذر الاسلام کی صرف ایک نظم کا ترجمہ شامل ہے وہ نظم عشقیہ ہے اور اس کا عنوان ہے۔

"میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کروگی مجھ کو"

ایسی نظم میں نذر الاسلام کا آتشیں انداز تلاش کرنا کہاں کی خوش مذاقی ہے اور ایک نظم کو کھینچ تان کر نظمیں بتانا کیا راست گفتاری ہے۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے

نیاز مند۔ اثر

ہمایوں سالانہ

ہمایوں کے بند ہونے پر مجھے بہت سے خطوط اور پیغامات آئے ہیں۔ ان میں کچھ تو محض رسمی "تعزیت" کے خطوط ہیں جن کا پبلک طور پر شکریہ ادا کرنا کافی ہے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن میں خلوص و الفت یا غم و غصہ کی زبان سے ہمایوں کی قدر دانی اور اس سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے اور جو دل سے نکلی ہوئی بات کی طرح دل پر اثر انداز ہونے اور دل میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ کئی احباب نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اگر ہمایوں کا ماہوار صورت میں اجرا ممکن نہیں تو اس کے مخصوص ادبی و اخلاقی نصب العین اور روایات کو قائم رکھنے کے لئے اسے سال میں کم از کم ایک بار ایک سالنامے کی صورت میں شائع کیا جائے۔

جہاں میں اہل اردو سے اپنی کوتاہیوں کے لئے معذرت خواہ ہوں وہاں اپنی ذمہ داری اور اپنی بساط کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے دوستوں اور بعض ادیبوں کی اس تجویز کو کہ ہمایوں ایک سالنامے کی صورت میں جاری رکھا جائے بخوشی قبول کرتا ہوں اور ہمایوں کے بہی خواہوں کو مطلع کرتا ہوں کہ انشاء اللہ آئندہ ہر سال کے شروع میں ہمایوں ایک سالنامہ کی صورت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔ اس سلسلے میں میں اردو کے انشا پردازوں اور*

خطبہ جناب پنڈت راج ناتھ کنزرو

جناب پنڈت راج ناتھ کنزرو صاحب نائب امیر جامعہ اردو نے جلسہ تقسیم اسناد جامعہ اردو علی گڑھ میں ۲۰ مارچ ۱۹۷۸ کو جو خطبہ پڑھا اس کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

اراکین جامعہ، خواتین و حضرات!

آپ نے مجھے یہاں بلا کر جو عزت بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو اس منصب عظیم کا سزاوار نہیں سمجھتا۔ یہ رسمی انکسار نہیں ہے، میرے ضمیر کی آواز ہے۔

۱۹۲۸ء کا وہ دن کتنا مبارک تھا جب بزم اقبال آگرہ کی مجلس منتظمہ نے یہ طے کیا تھا کہ ادبی جلسوں اور مشاعروں کے ساتھ ساتھ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کوئی ایسا ٹھوس کام بھی ہونا چاہئے جس سے اردو جاننے اور بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ بہت سی تجویزیں سامنے آئیں۔ آخر میں شبینہ درسگاہیں کھولنے اور لائبریریاں قائم کرنے پر بڑا اصرار تھا۔ مگر میں نے بزم اقبال آگرہ کے اراکین سے یہ کہا کہ اگر آپ لوگ سچ مچ اردو کی ترقی کے لئے کوئی ٹھوس کام کرنا چاہتے ہیں تو قدما جماعت زمانہ سے کام لے کر اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کر دیجئے۔ میری آواز پر سب سے پہلے پروفیسر محمد طاہر فاروقی سابق رجسٹرار جامعہ اردو نے بڑھ کر لبیک کہا اور مولانا حامد حسن قادری سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو سینٹ جانسن کالج آگرہ نے امتحانات کے نام تجویز کئے، ان کا معیار متعین کیا اور ان کے لئے نصاب مرتب کیا اور اس طرح نومبر ۱۹۳۹ء میں جامعہ اردو کے پہلے امتحانات ہوئے اور ان امتحانات میں ۱۹ سنٹروں سے ۱۵۸ امیدوار شریک ہوئے۔

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک جامعہ اردو کا مرکزی دفتر آگرہ میں رہا اور ۱۹۴۸ء میں جامعہ کا دفتر علی گڑھ منتقل ہوا اور سید [illegible] صاحب علوی اس کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جس طرح اردو کے بعض چوٹی کے شاعر آگرہ کی خاک سے اٹھے۔ آگرہ کی شاعرانہ فضا میں ان کے ادبی ذوق کی تربیت ہوئی مگر ان میں سے کوئی دہلی میں جا کر چمکا، کوئی لکھنؤ میں جا کر جگمگایا۔ اسی طرح اردو زبان کی یہ تحریک بھی آگرہ سے نکل کر علی گڑھ میں زیادہ پھلی پھولی۔ اسے علوی صاحب کی کرامت کہوں یا سرسید کا فیض روحانی سمجھوں کہ جن امتحانات کے امیدواروں کی تعداد ۱۹۴۸ء میں ۲۴۲ اور سینٹروں کی تعداد صرف ۲۲ تھی ان امتحانات نے ۳۰ سال کے عرصے میں ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ آج سینٹروں کی تعداد ۴۵۰ اور شرکائے امتحانات کی تعداد (۲۵۰۰۰) ہے اور پھر ہندوستان کے پچھلے آٹھ سال اردو پر جیسے سخت گزرے اور یو پی میں اردو کو مٹانے کی جیسی کوششیں پچھلے چند سالوں میں ہوئیں انھیں سامنے رکھ کر اگر جامعہ کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ صرف علی گڑھ کی فضا یا محض علوی صاحب کا غیر معمولی انہماک ہی اس ادارہ کے فروغ کا باعث نہیں ہے بلکہ

ہے کوئی مرشد بھی ہے اس پردۂ زنگاری میں

مجھے نائب شیخ الجامعہ جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی معاف فرمائیں میں نے ان کی اصطلاح بغیر ان کی اجازت کے استعمال کی ہے اور اس اعتماد کے ساتھ استعمال کی ہے کہ ہر بڑا ادیب اور شاعر زبان کو جو نئی علامتیں اور اصطلاحیں دیتا ہے وہ قوم کی تہذیبی میراث بن جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کا رچا ہوا ذوق رکھنے والا ہر شخص جتنا اقبال کے شاہین اور قلندر سے واقف ہوگا اتنا ہی رشید صاحب کے مرشد کو بھی پہچانتا ہوگا اس لئے میں نے بجائے نام لینے کے رشید صاحب کی زبان میں مرشد کہہ دیا۔ یہ ان کی پرسوز، تابناک اور دلکش شخصیت کی روحانی کا اثر ہے کہ آج اس شمع علم کی روشنی یو پی سے نکل کر مشرق میں کلکتہ تک، شمال مغرب میں سرینگر کشمیر تک، جنوب میں مدارس تک پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے آج جامعہ اردو کے جلسہ تقسیم اسناد کا وہ دن یاد آتا ہے جب جامعہ کی اسی تقریب میں اور یونین کے اسی ہال میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے انجمن ترقی اردو کی علاقائی تحریک کی وضاحت کرتے ہوئے بڑے باوقار اور پُراعتماد انداز میں یہ کہا تھا کہ اردو کی علاقائی حیثیت کے مطالبہ کو جو فرقہ پرست سیاسی یا مذہبی رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں انھیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس وقت اردو کا سوال جمہوریہ ہند کے دستور کی لاج کا سوال ہے۔ ابھی تک حکومت نے انجمن ترقی اردو کی عرضداشت کا باضابطہ جواب نہیں دیا ہے لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تحریک پر ملک کے طول و عرض میں اردو کو فروغ دینے کی جو منظم اور مستقل کوشش ہو رہی ہے یہ امتحانات اس کی ایک اہم کڑی ہیں۔

(باقی آئندہ)

بہت ضروری

دفتری خط و کتابت کے پتے میں صرف جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ لکھئے کسی کا نام ہرگز نہ لکھئے۔ نام لکھنے سے جواب دینے میں دیر ہو جاتی ہے۔

ہماری صحافت

(بہ سلسلہ گذشتہ)

ماہنامہ اور سہ ماہی رسائل

۵۶	منادی	دہلی	ایڈیٹر	حسن ثانی نظامی
۵۷	نظامی	〃	〃	پیرزادہ خواجہ احمد نظامی
۵۸	سوغات	نئی دہلی	〃	شاہد خان
۵۹	تحریک	دہلی	〃	گوپال متل
۶۰	برہان	〃	〃	سعید احمد اکبر آبادی
۶۱	رہنمائے تعلیم	〃	〃	جوش ملسیانی ۔ شیخ محمد اسمعیل پانی پتی
۶۲	شان ہند	〃	〃	سرمد تونسوی
۶۳	آج کل	〃	〃	بال مکند عرش ملسیانی
۶۴	بانو	〃	〃	زینت انور
۶۵	شعلہ و شبنم	〃	〃	بیل جین ۔ محمود ذکی
۶۶	شاہراہ	〃	〃	محمد یوسف جامعی
۶۷	بیسویں صدی	〃	〃	خوشتر گرامی
۶۸	تعلیم و ترقی	〃	〃	پروفیسر محمد مجیب ۔ برکت علی فراق رفیق محمد شاستری
۶۹	فاران	کراچی	〃	ماہر القادری
۷۰	تجلی	〃	〃	سید سلطان احمد
۷۱	مہر نیمروز	〃	〃	حسن مثنیٰ ندوی ۔ ابوالکشفی علی اکبر قاصد
۷۲	طلوع اسلام	〃	〃	اسے رب
۷۳	تذکرہ	〃	〃	بشیر محمد
۷۴	نقشیات	〃	〃	اسلام حسین
۷۵	نئی دور	〃	〃	محمد رحیم
۷۶	سوداگر	〃	〃	سلطان احمد اشرف ۔ اجمل الرحمٰن
۷۷	ماہ نو	〃	〃	رفیق خاور
۷۸	ہمدرد صحت	〃	〃	حکیم حافظ محمد سعید
۷۹	ہمدرد نونہال	〃	〃	ثریا ہمدرد
۸۰	نقش	〃	〃	مشفق خواجہ
۸۱	افکار	〃	〃	صہبا لکھنوی
۸۲	نمک دان	〃	〃	مجید لاہوری
۸۳	اردو	سہ ماہی	〃	مولوی عبدالحق
۸۴	نیا دور	سہ ماہی	〃	ثنا اللہ
۸۵	کتابی دنیا	〃	〃	ضیاء الدین احمد برنی

(باقی)

تبصرے

علی گڑھ میگزین

پہلا شمارہ ۱۹۵۷ء حجم ۲۸۹ صفحے
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادبی مجلہ کا یہ شمارہ قمر رئیس صاحب کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ سائز کاغذ کتابت وطباعت ہر لحاظ سے دیدہ زیب ہے مضامین کے تنوع کے ساتھ ساتھ حسن ترتیب بھی ہے یوں تو مقالات کا حصہ اور دوسرے مضامین نظم و نثر بھی اعلیٰ معیار کے حامل ہیں لیکن سرگزشت اور آزاد نظم (سمپوزیم) کے حصے خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ رشید صاحب کا مقالہ نامکمل ہونے کے باوصف وقیع اور دلچسپ ہے بہتر ہوتا کہ قمر رئیس صاحب دوسرے شمارے میں اس کا باقی نصف حصہ بھی شامل کر دیتے۔ اختر انصاری صاحب اور ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے مضامین بھی بڑے سلیقے اور شگفتہ و دلچسپ اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ قمر رئیس صاحب نے محنت اور کاوش سے مضامین حاصل کئے ہیں امید ہے کہ دوسرے شمارے میں وہ ترتیب و طباعت کا یہ معیار برقرار رکھیں گے۔

گاندھی جی

حجم ۲۰ صفحے سفید کاغذ قیمت ۱۲ آنے
ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے مجلس تعلیم بالغان کے سلسلے کی تالیفات میں یہ منظوم کتاب چھاپی ہے ٹائٹل پر گاندھی جی کی تصویر بھی ہے۔ خورشید احمد صاحب جامی نے سادہ اور سہل انداز میں بالغوں کے لئے یہ نظم لکھی ہے۔ قیمت کچھ کم ہوتی تو اچھا تھا۔

کتابیں ملیں

تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت

مصنفین :- ڈاکٹر عزیز احمد و عزیز کوشمیری
ناشر: انجمن اشاعت اسلام سرینگر کشمیر حجم ـ صفحات ۲۵۶
کاغذ اچھا۔ قیمت دو روپے

سروجنی نائیڈو (دلہن حصہ) مصنف :- وزیر حسن
ناشر ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن
حجم صفحات ۱۰۵۔ کاغذ اچھا قیمت دو روپے۔

غیر معروف شعرا

(۲)

خیراتی خاں دل سوز

(بسلسلۂ گذشتہ)

مختار الدین احمد

ڈبوتے ہیں کبھو اس پاس سے پیغام کرتے ہیں
عبث یہ لوگ ناحق اس سے اب بدنام کرتے ہیں

بدن جھمکے ہے ایسا شیشے فانوس میں گویا
وہ پستان کر جس وقت آپ آرام کرتے ہیں

کبھو تنہا جو ملتے ہیں تو کر لیتے ہیں دو باتیں
نہیں چوری تو یوں آپ ہی ہم اپنا کام کرتے ہیں

کبھو دیکھیں ہیں عارض کو کبھو دیکھیں ہیں زلفوں کو
بسر اوقات اپنی یوں سحر اور شام کرتے ہیں

مرے نالے کو سن کر دل سوز یوں کہنے لگے
یہ سمجھتے ہیں وہ یہ دامن بدنام کرتے ہیں

پردہ جنبش کرے ہے گوشہ پر نقاب کا
تکتا ہے کب حجاب سے مہ آفتاب کا

خورشید حشر کے جوت میں ہوا کیا مجھے
عالم شباب ہو دل خانہ خراب کا

مانند مہر بات میری جب کٹے زباں
مقدور دہاں کسے ہو سوال و جواب کا

کیوں کر دو اس پری پہ دل بیتاب ہو دل
نکلی ہے خوب وہ سرے ماہ شباب کا

دل سوز کیا ہے خوف مجھے روز حشر سے
دامن ہے ہاتھ میرے شہ بوتراب کا

پوچھا اس زمانے کو بہانے سے چاہ کی
لیکن کسی نے دیکھی نہ صورت نباہ کی

صورت سے رقیب کے ہو ہی ہے دل تنگ
تیرہ میں اس نے ادھر بھی نگاہ کی

کیا خوب کاوات یہ اندر ادا ہے منھ
برباد آج تو اس زلف سیاہ کی

دیر و حرم کو دل سے مری کھو گئی ہوس
سب سے ہے خاک در ترے بار گاہ کی

عیش دل چھیڑ اس کو نہ بے ڈھب کیا کرو
دل سوز تو بات وہ کہتا ہے راہ کی

ماخذ:

بیاض رنگین : ملوکہ راقم

بہار شعرا : خوب چند ذکا نسخہ وزارت ہند انڈیا آفس ورق

۴۰۰ ب عکس ملوکہ جناب مالک رام ایم اے

مجموعۂ نغز : حکیم قدرت اللہ قاسم ۱ / ۲۵۲

گلشن بیخار : شیفتہ : ۷۰

پشکن کی برسی

اس سال روسی عوام نے الگزینڈر سرگیوچ پشکن کی ایک سو بیسویں برسی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ منائی ہے۔ اس تقریب میں ماسکو کے ہزاروں شہریوں نے اپنے عظیم شاعر کے مجسمے کے سامنے مؤدب کھڑے ہو کر خراج عقیدت پیش کیا۔

پشکن اپنے دور کا محض ایک عظیم روسی شاعر ہی نہیں تھا بلکہ اس کی عظمت ہر قوم اور ہر زمانہ سے وابستہ ہے۔ پشکن نے ادب میں حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی اور اسے روس کی سچی تہذیب کا علمبردار بنایا۔

الگزینڈر سرگیوچ پشکن نے ۶ جون ۱۷۹۹ء میں ماسکو کے ایک مہذب خاندان میں آنکھ کھولی۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک کی باگ ڈور زار شاہی کے ہاتھ میں تھی اس بلند پایہ فنکار کی شاعری جب سن بلوغ کو پہنچی تو روسی اقتدار کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسے روس کے مختلف حصوں میں جلاوطن کیا گیا۔ ان حالات نے پشکن کو روس کی حقیقی زندگی سے روشناس کرایا اور انہی ایام میں اس نے اپنے عظیم فن پارے تخلیق کئے۔ آخر کار روس کے نئے ادب کا یہ بانی ایک سازش کے تحت ایک فوجی افسر کے ہاتھوں مقابلے کی لڑائی میں ایسا زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا اور ۱۰ فروری ۱۸۳۷ء میں انتقال کر گیا۔

طبقات شعرا : کریم الدین : ۲۰۶

سخن شعرا : نساخ : ۱۷۷

عمر خانہ جاوید ۳/۲۹۰

طبقات سخن : مبتلا دہلوی میرٹھی (یادگار شعرا : شپرنگر طفیل احمد ۱۰۶)

معاصرین

مشاعروں کی افادیت

(جناب حامد بھوپالی کے خطبۂ صدارت سے اقتباس)

شعر و ادب کی خدمت ہر ملک و قوم میں مختلف طریقوں سے ہوتی چلی آئی ہے۔ لیکن اردو زبان کے پرستاروں نے اپنے شعری ادب کی خدمت کا مشاعروں کی شکل میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مشاعروں کی ابتدا اردو زبان کے جنم لیتے ہی ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ اردو زبان کی یہ تنہا خصوصیت ہے کہ وہ پہلے نظم میں جلوہ گر ہوئی پھر نثر میں سامنے آئی۔ جس طرح اردو عوام کے باہمی اخلاص اور ایک مشترکہ کلچر کی پیداوار ہے اسی طرح شاعری عوام کے جذبۂ مشترک یعنی اردو شاعری سے پیار کا نتیجہ ہیں۔ اردو شاعری کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ پس منظر میں شعرا اور سامعین کی محفل جمی ہوئی نظر آئے گی۔ شعرا سننے والوں کے بغیر بے چین ہیں اور سننے والے شعرا کے بغیر۔

یوں تو مشاعرہ کی ابتدا شاہی محلات کے اندر ہوئی۔ جہاں عوام کی رسائی مشکل تھی لیکن مشاعرے عوام کی چیز تھے وہ ان کو محلات کی چار دیواری سے باہر کھینچ لائے۔ کیا ہوا جو غریب عوام اپنے پسندیدہ شعراء کو خلعت و انعام سے نہیں نواز سکے۔ ان کے پاس محبت بھرے تحسین و آفرین کے کلمے تو تھے، اور انھیں کلموں نے شعرا کو درباروں سے بے نیاز کر دیا۔ مشاعروں کے سبب اردو شاعری اور عوام کے درمیان ایک گہرا تعلق ہوا ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ آج ہر ادبی، سیاسی، سماجی پروگرام مشاعرے کے بغیر نا مکمل سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کوئی محفل اتنی کامیاب نہیں ہوتی جتنے مشاعرے کامیاب ہوتے ہیں۔

اردو زبان کی ترقی میں مشاعروں نے نمایاں اور اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کے ہزاروں شعرا مشاعروں میں عوام سے متعارف ہوکر اور ہمت پاکر اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ آج کے حالات میں مشاعرہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ آج سے پہلے اردو کی ترقی میں عوام کی کوشش کسی دیوار سے نہیں ٹکرائی تھیں آج چاروں طرف تعصب اور تنگ نظری کی دیواریں کھڑی ہیں۔ اردو دشمن عناصر اسے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں اردو کو مٹانے کا مطلب عوام کی کھلی ہوئی دولت ہے

کیسے افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ دنیا کی جمہوری ریاستوں میں مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبوں کی بقا اور ترقی کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں اسی ملک کی ایک زبان پر چھری چلانے کی ٹھان لی گئی ہے۔ وہ زبان جو جمنا کی لہروں کا سہانا گیت ہے۔ جو برج کی مرلی کی تان ہے جو تاج محل پر چھٹکی ہوئی چاندنی ہے۔ اردو زبان کو ختم کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی دیوانہ تاج محل ڈھا دینا چاہے۔ جمنا کی لہروں کو روکنے کی کوشش کرے۔ برج کی مرلی کو توڑ دینا چاہے۔ تاج کو ڈھا دو جمنا کو خشک کردو۔ برج کی مرلی توڑ دو۔ پھر ہندوستان میں رہ کیا جائے گا جس سنسکرتی اور بھاشا کے کارن اردو کی راہ میں کانٹے بچھائے جارہے ہیں اسی سنسکرتی اور بھاشا نے تو اردو کو جنم دیا ہے ماں سے پیار بیٹی سے بیر کس دیس کی ریت ہے۔ میں صاف کہے دیتا ہوں کہ اردو نفرت سے مٹائی نہیں جاسکتی۔ اردو پیار کی نشانی ہے۔ اور پیار امر ہے۔ اردو عوام کی زبان ہے۔ اور عوام اپنی زبان اپنے ہاتھوں نہیں کاٹ سکتے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ آج مشاعرے کی اہمیت بڑھ گئی ہے اردو لغت کے باوصف ہم مشاعروں کے ذریعے اردو کو زیادہ سے زیادہ عوام سے روشناس کر سکتے ہیں۔ لیکن محض اردو کی نشر و اشاعت ہی مشاعرے کا مقصد قرار دے دینا غلط ہے آج ہمارا شعری اور نثری ادب اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں ہم اس سے بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔ مشاعروں کے ذریعے ہم عوام کو ان کے بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ ان کے سوئے ہوئے شعور کو جھنجھوڑ سکتے ہیں۔ انھیں دکھی انسانیت کو مطمئن کرنے کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں۔ (از بہارستان پالاپور)

لکھنؤ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

(سید احتشام حسین)

ابائی اثرات اور غربت کے ساتھ ہیں اس وقتی خوش حالی اور عارضی فارغ البالی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جس نے بربادی اور تباہی کے ہولناک غار سے نگاہیں ہٹا کر تھوڑے دنوں کے لئے علم و فن میں دلچسپی لینے کا موقع فراہم کیا۔ یہ ایک حیرت ناک بات ہے لیکن کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب سے حکومت کی نیو مضبوط ہوئی یعنی وزیر الملک نواب شجاع الدولہ کے وقت سے انتزاع سلطنت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اودھ کی حکومت نے کچھ کھویا نہ ہو جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دام سیاست کے پھندے اور زیادہ کسے نہ گئے ہوں جس میں زوال آمادگی میں اضافہ نہ ہوا ہو۔ پھر بھی ایک عارضی سکون، ایک وقتی فارغ البالی کا دور ضرور تھا اور لکھنؤ میں فردوس البلاد کی شکل اختیار کر رہا تھا اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی علم دوست اور رعایا پرور حاکم، سخی اور حق شناس امراء، صاحب علم و تدبیر وزراء اور عمال حکومت، دہلی سے آئے ہوئے شعراء، فن کار، ماہرین موسیقی اور پھر ان سب پر بالا ایک رنگین عیش پسند اور خوبصورت فضا۔ لکھنؤ پر ٹوٹ کر بہار آئی اور کل سو سال کے عرصے میں تہذیبی زندگی نے ایسے پر و بال پیدا کر لئے کہ دہلی تو دہلی شیراز و اصفہان کی رونق اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہوا اور آصف الدولہ حکومت پر آئے ان کے آتے ہی لکھنؤ کے دن پھرے، اونچی نیچی راہیں ہموار ہونے لگیں، چھوٹے چھوٹے مکانوں نے عالی شان محلوں کو جگہ دی، جنگلوں نے باغ اور چمن کا روپ دھارا اور یہاں کے بسنے والے اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے۔ شاعروں اور عالموں کی آمد کا سلسلہ تو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن اب تو یہ حال تھا کہ خواجہ میر درد کو چھوڑ کر دہلی کے تقریباً سبھی باکمال شعراء پروانہ وار لکھنؤ کی طرف جھپٹے ان میں سراج الدین خاں آرزو کے سے علماء تھے اور سودا اور میر کے سے شعراء۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ جب یہ بڑے بڑے شعراء یہاں آئے تو یہاں کوئی ادبی روایت موجود تھی یا نہیں۔ اودھی کی اس شاعری کو چھوڑ دیجئے جس نے پدماوت اور رام چرت مانس کی شکل میں جنم لیا تھا کیونکہ ان کے اور اردو شاعری کے درمیان فکر و فن کی بڑی وسیع خلیج حائل تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ میں ادبی روایت کی ابتدا انہیں دہلی کے شعراء سے ہوتی ہے اور بہت دنوں تک کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی جس سے لکھنؤ کی مرکزیت کے خدوخال نمایاں ہو سکیں۔ پھر آہستہ آہستہ وقت نے اپنا جادو چلایا۔ دہلی سے آزاد ایک نئی ولولہ انگیز اور نشاط آور زندگی کے تصور نے بزم آرائی کے نئے طریقے سکھائے۔ میلوں ٹھیلوں نے سنجیدگی کے پردے ہٹائے، رسم و رواج نے مذہبی تفریق کی حدیں توڑ دیں، تہواروں اور موسموں سے دلچسپی نے ایک دوسرے سے قریب کیا، فرصت اور فارغ البالی، قدردانی اور سرپرستی نے نفاست، نازک خیالی اور انوکھے پن کی ہمت افزائی کی اس طرح لکھنؤ نے ایک امتیازی شکل اختیار کر لی۔ غور کیجئے تو اس تمدنی ارتقا کے لئے وقت بہت کم ملا اور زمانہ بھی ایسا ہاتھ آیا جب وہ تہذیب اپنا تاریخی فرض پورا کر کے رہی تھی اور مادی حیثیت سے ایک برتر اور ترقی یافتہ زندگی کے لئے جگہ خالی کر رہی تھی لیکن اس تہذیب کے اندر جو حسن، نزاکت، لطافت، رچاؤ اور ملیح ہے وہ اسی عہد میں پیدا ہو سکتا تھا۔ لکھنؤ کے لئے یہ کہنا اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی کہ اس نے محض شعر و ادب کے ایک مخصوص رنگ کو چمکایا کیونکہ لکھنؤ ہی میں یونانی، لاطینی اور انگریزی سے سائنس کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے، سائنس کے لئے ایک تجربہ گاہ کا قیام عمل میں آیا، شاہی سرپرستی میں پریس کھلے اور اعلیٰ پایے کی کتابیں چھپیں، ایک عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد رکھی گئی اور رہس اور اندر سبھا کے ذریعے ہندوستان کے مٹتے ہوئے اسٹیج کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح لکھنؤ ایک ادبی مرکز یا دبستان شاعری ہی نہیں ایک تہذیبی مرکز تھا جس نے فنون لطیفہ اور علوم کو اس طرح رواج دیا کہ صرف خواص ہی نہیں عوام بھی ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔

عام جاگیردارانہ زوال اور بیرونی طاقت کے عروج کی روشنی

میں اتنا تہذیبی اثر بھی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے اگر لکھنؤ کے ادبی کارناموں کا مطالعہ اس حیثیت سے کیا جائے تو انشا، مصحفی اور جرأت کا عہد آہستہ آہستہ دہلی کے معیار سے ہٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی تکمیل ناسخ اور آتش کے ہاتھوں ہوئی۔ زبان کی ایسی تراش خراش، محاورات اور روزمرہ کی ایسی چھان بین صنائع کے استعمال کی طرف ایسی توجہ شاید ہی کہیں اور کسی دوسرے عہد میں کی گئی ہوگی۔ نتیجہ یہی ہوا کہ یہی چیزیں لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز قرار پائیں۔ اور یہ بادل اس فضا پر اس طرح چھائے کہ شعر و سخن کے چمکتے ہوئے ستارے بھی اسی میں چھپ گئے ایک تیز ناقدانہ نگاہ اس اندھیرے کے اندر بھی آتش کی غزل گوئی، میر حسن، نسیم اور شوق کی مثنوی نگاری، انیس، دبیر، نفیس، مونس، انس، عارف، وحید اور عروج کی مرثیہ نگاری کے جلوے دیکھ سکتی ہے اور ہندو مسلمان کے تہذیبی اختلاط سے پیدا ہونے والی تہذیبی سرگرمیوں کا عکس واجد علی شاہ کے اور امانت کی اندر سبھا میں، رقص اور موسیقی کے احیاء میں پا سکتی ہے۔ زبان اور انداز بیان، رنگینی اور صناعت ظاہری حسن اور نوک پلک پر غیر معمولی زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں حسن کی زیبائش کے لئے زیوروں کی ضرورت نہ تھی وہاں بھی ان سے کام لیا گیا۔ چنانچہ شاعری کے ساتھ نثر بھی ادبی آرائشوں سے گرانبار ہو گئی اور شاعری یا نثر نگاری اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر استعمال زبان کا ایک کرتب بن گئی۔ یقیناً اس کا کفارہ آتش کی غزلوں، نسیم اور شوق کی مثنویوں اور انیس کے مرثیوں نے ادا کر دیا، زبان کی صحت، لچک اور حسن استعمال نے عیوب کے بہت سے دھبے دھو دیئے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہی کہ یہاں کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ادب کی حیثیت سے نہیں زبان کی حیثیت سے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔

غدر کے بعد لکھنؤ پر جو تباہی آئی وہ گو بظاہر ایک حکومت کے خاتمے کی صورت میں نمایاں ہوئی لیکن اصلاً اس تہذیب پر بھی اس کی گہری چوٹ پڑی جو سکون، فرصت، فارغ البالی اور خوش حالی چاہتی تھی۔ اس لئے فوراً ہی اس کا تضاد نمایاں ہو گیا اور گو داستانوں نے جو طلسم باندھا، اس میں اسی عہد فراغت کی تصویریں نگاہوں کے سامنے آتی ہیں جو غدر سے پہلے تھا لیکن اس کے مٹتے ہوئے اور مٹ کر ابھرتے ہوئے نقوش سرشار کے فسانۂ آزاد میں نظر آتے ہیں۔ غدر کے بعد لکھنؤ نے سرشار، دل گداز، شرر، اور ہجر، اور چکبست کو پیدا کر کے اپنی مرکزیت برقرار ہی نہیں رکھی بلکہ اس میں تحقیقی اضافہ کیا اور کئی راہوں پر ملک کی ادبی زندگی کی رہنمائی کی اگرچہ جدید تحریکات کا اثر لکھنؤ پر ذرا آہستہ آہستہ ہوا۔ اور ہوا بھی تو اس کی رنگینی لطافت اور نزاکت کا کچھ حصہ برقرار رہا۔ لیکن سرشار، شرر، اور ہجر، اور چکبست، نادر کاکوروی اور صفی کی موجودگی میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ لکھنؤ نے اپنے حصار کے اندر تازہ ہواؤں کو آنے ہی نہیں دیا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں ایک بیمار حسینہ کا حسن تھا، توانائی اور بھرپور زندگی سے خالی، پھر اس کی نگہبانی بیرونی عناصر سے ہوتی رہی، اس لئے اس کے نقوش جلد دھندلے ہو گئے۔ دور جدید کی حشر سامانیوں نے اس سے بہت کچھ چھین لیا پھر بھی اس کی علمی اور ادبی مرکزیت قائم ہے اور جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے ایک امتیازی رنگ میں اس کا فیض آج بھی جاری ہے۔ آج بھی یہاں کے علمی ادارے، تہذیبی انجمنیں، ادبی مرکز ایک معیار رکھتے ہیں۔

اطہر پرویز پرنٹر پبلشر نے مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔